ڈاکٹر انوار احمد

اُردو کا ایک غیر معمولی افسانہ نگار — اشفاق احمد

اشفاق احمد اردو افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل سے تعلق رکھتے ہیں، مگر کچھ عرصہ پہلے تک ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک طرح سے افسانہ لکھنا ترک کر چکے ہیں یا پھر اپنی دانست میں اپنی افسانوی واردات کے لیے نیا میڈیم اور نئی فارم دریافت کر چکے ہیں۔ جس کی بدولت وہ چند سو ادبی قارئین کے عوض لاکھوں سامعین اور ناظرین کی توجہ کے ساتھ ساتھ مالی استحکام بھی پا چکے ہیں اور ٹیلی ویژن کی دو سیریز اور ڈرامے اور 'توتا کہانی'، کے باعث ان کا نام متنازعہ فیہ بن چکا ہے چناں چہ اشفاق احمد پر اکثر 'ابن الوقت'، کی پھبتی کسی جاتی ہے لیکن ان کے شدید ترین مخالف بھی ان کے شاہکار اور لازوال افسانے 'گڈریا'، کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے حیرت ہوتی ہے جب ہم 'گڈریا'، کے مرکزی کردار داؤ جی پر نذیر احمد جیسے افسانے کے اہم ناقد کے یہ اعتراضات دیکھتے ہیں:

> ''افسانہ نگار نے جو عمارت کھڑی کی ہے اس نے داؤ جی کے کردار کو بحیثیت مجموعی بہت عجیب وغریب اور بے ڈھنگا بنا دیا ہے۔ وہ مذہباً ہندو ہے۔ لیکن آیات قرآنی کا ورد کرتا ہے۔ فارسی اشعار کا رسیا ہے اس کا ظاہر ہندوانہ، باطن مومنانہ..... داؤ جی پر یہ سارا بوجھ اس لیے لادا گیا ہے کہ اسے انسان دوستی کی علامت بنایا جا سکے۔'' (اشفاق احمد کی افسانہ نگاری..... 'فنون'، نومبر، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۴۰۲)
>
> ''آفتاب (جلاوطن..... قرۃ العین حیدر) بڑا قد آور کردار ہے اور اس کی

ناکامی میں المیہ کی شان ہے اس کے سامنے اشفاق کا داؤ جی بونا اور بے ڈھنگا ہے اس (داؤ جی) اس کے انجام میں میلو ڈرامائی عنصر ہے۔''

(ایضاً، ص ۴۰۳)

اگر ہم ان اعتراضات کے جواب کے لیے داؤ جی سے ہی رجوع کریں تو اس کے کلام کا اخلاص اس تضاد کو تو حل کر دیتا ہے جو اس کی ہندوانہ چوٹی اور مومنانہ کردار میں دکھائی دیتا ہے۔

''میں ذات کا گڈریا، میرا باپ منڈاسی کا گوالا، میں جہالت کا فرزند، میرا خاندان ابوجہل کا خانوادہ، اور آقا کی ایک نظر کرم، حضرت کا ایک اشارہ، حضور نے چتو کو منشی چنت رام بنا دیا، لوگ کہتے ہیں، منشی جی، میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار۔'' (اجلے پھول، ص ۸۲)

''شکر کردگار کنم کہ گرفتارم بہ مصیبتے نہ کہ بہ معصیتے..... میں تو اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں، جس کے سرِ مطہر پر مکّے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔'' (اجلے پھول، ص ۱۹۴)

''(سر پر بودی) میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے زندگی کی طرح عزیز ہے۔'' (اجلے پھول، ص ۲۰۹)

بلاشبہ داؤ جی کے کردار کی تشکیل میں آئیڈیلزم کا بڑا حصہ ہے، مگر نہ صرف ایک ہزار برس کی ثقافتی روایت بلکہ بھگتی اور تصوف کے انسان دوست رویوں کے تناظر میں داؤ جی کو دیکھیں تو اس ہندو کردار کی بیٹی (قرۃ العین) داؤ جی کی بیوی کہتی ہے ''تو نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے سینے لکھوا دیے ہیں'' (ص ۱۷۴) کے بیاہ کے لیے استخارہ کرنا، ڈولی میں روتی ہوئی بیٹی سے کہنا ''لاحول پڑھو بیٹی، لاحول پڑھو'' (ص ۲۰۷) حکیم ناصر علی ملیستانی سے علم ہندسہ پڑھنا، پورا سکندر نامہ زبانی یاد کرنا، اپنے معذور مسلمان محسن اور معلم کو کندھوں پر، اٹھائے اٹھائے پھرنا اور حال کھیلنا، خلافِ قیاس نہیں — رہ گئی بات قرۃ العین حیدر کے ڈاکٹر آفتاب رائے کی تو بلاشبہ وہ ایک دل کش کردار ہے۔ مگر دو باتیں یہاں بھی پیش نظر رکھنی چاہئیں ایک تو یہ کہ

قرۃ العین حیدر کے معمر کردار بالعموم مہاتما بودھ کی طرح خاموش رہتے ہیں اور ان کی چپ ماحول کو گمبھیر ہی نہیں سوگوار بھی بناتی ہے، جب کہ اشفاق احمد کے تنہا، اداس اور دل گرفتہ کردار بولتے ہیں اور ان کے یہ مکالمے بھی دل پروار کرتے ہیں 'گڈریا' کا اختتامی حصہ بے حد موثر ہے مگر یہاں بھی داؤ جی کا ایک استفسار قیامت ڈھاتا ہے، دیکھیے انہیں نام کے مسلمان اپنے جیسا مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔

''کلمہ پڑھ پنڈتا،، اور داؤ جی آہستہ سے بولے کون سا؟، رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں۔ جب وہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ ''چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں اور ننگے سر، داؤ جی بکریوں کے پیچھے یوں چلے، جیسے لمبے لمبے بالوں والا فرید اچل رہا ہو۔'' (اجلے پھول، ص ۲۴۰)

دوسرے یہ کہ قرۃ العین حیدر کے ڈاکٹر آفتاب رائے جاگیرداری کلچر کے نمائندے ہیں۔ تعلیم یافتہ، مہذب، شائستہ، نفیس اور بڑے دل والے اپنے جذبات کو چھپانے والے — داؤ جی نچلے طبقے کا ایک فرد ہے جاوبے جا اپنی محبت چھڑکنے والا ''اپنی بیوی سے مار کھانے اور جھڑکیاں سننے والا'' ہر دم، ہر لمحہ اپنی اوقات کو یاد رکھنے والا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معلم ہونے کے ناطے ہر وقت بولنے والا — (''ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو، تم انہیں روکو مت، ٹوکو مت۔'') (ص ۱۷۴)

اصل میں اشفاق احمد کے فلسفہ حیات کا محور محبت ہے، اس کے نسبتاً ایک تازہ افسانے ''ماسٹر روشی'' میں ایک جگہ انجیل کے حوالے سے بالالتزام یہ بات کہی جاتی ہے۔ ''اگر میں سارے جہاں کی بولیاں بولوں اور تمام دنیا کے علم حاصل کر لوں، لیکن محبت نہ کروں تو میں ٹھنٹھناتا ہوا پیتل اور جھنجھناتی ہوئی جھانجھ ہوں۔'' (صبحانے افسانے، ص ۲۸)

داؤ جی کے علم کا جادو محبت کے اسم اعظم کے طفیل بولتا ہے۔ یہی نہیں اشفاق احمد کے افسانے ''عجیب بادشاہ'' میں بھی ایک آئیڈیل استاد پروفیسر دیس راج، محبت اور علم کا مجسمہ بنا کر

پیش کیا گیا ہے، جسے ہم داؤ جی کے کردار کا ابتدائی نقش کہہ سکتے ہیں— محبت کے اس غیر معمولی اور گرم جوش اظہار کو دیکھ کر ایلین اپنے شوہر وحید سے پوچھتی ہے۔ ''تمہارے دیس میں سارے دادے اپنے پوتوں سے کیا ایسا ہی پیار کرتے ہیں۔'' (بابا، ص ۲۰۲)

اسی طرح گھریلو ناچاقی کے سبب اپنے بیٹے کو ایک مرتبہ بے دردی سے مارنے والا باپ، عمر بھر محبت سے آنکھیں نہیں ملا سکتا اور لٹ لٹا کر سرحد پار آتا ہے تو دنیا جہان کا کرب اس کی اس صدا میں مجسم ہو جاتا ہے۔ ''ماسٹر جی میں پڑھا لکھا مہاجر ہوں۔ مجھے اپنا ماتحت رکھ لیجیے۔ میں بچوں کو بالکل مارتا نہیں۔'' (پناہیں، ص ۲۵۶)

یہی محبت ''امی'' کے منہ بولے جواری بیٹے کے لبوں پر آخری وقت موت سے مہلت کی اپیل بن کر ناچتی ہے۔ یہی محبت ٹی بی وارڈ میں بیڑس کو اتنی قوت اور اعتماد دیتی ہے کہ وہ نہ صرف ناک پر حفظِ جان کا رومال نہیں رکھتی بلکہ اپنا خون بھی مریضوں کو دیتی پھرتی ہے یہ محبت انسانی اور جسمانی سطح پر بھی ہے، مگر اشفاق احمد کے محبت کرنے والے تمام کردار اپنے دکھ اور ملال سے پہچانے جاتے ہیں۔

اشفاق احمد کے ہاں اجتماعی معاشرت کا گہرا مشاہدہ جلوہ گر ہے۔ اگرچہ انہوں نے شعوری طور پر ترقی پسند ادیبوں کے ہجوم میں گھرنا پسند نہیں کیا تاہم سیاسی حوالے ان کی بعض کہانیوں میں موجود ہیں جیسے ان کے پہلے ہی افسانے ''توبہ'' میں مسلم لیگ کا ذکر یوں آیا ہے ''کیا نام، لیگ کا سب سے بڑا افسر آیا تھا، ہماری تو ساری کی ساری برادری کیا نام ادھر ہی وہ دے گی، اپنے باپ دادا تو سالے ساری عمر بکتے ہی رہے ہیں پر ہم سے تو وہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے رتبے کے آدمی کی وہ نہ مانیں اور دو رپلی لے کر بھگت جائیں۔'' (ایک محبت سو افسانے، ص ۱۶، ۱۷)

داؤ جی کے اپنے بیٹے امی چند کے رویے میں ہندو مسلم کشیدگی یا تناؤ کا اظہار ملتا ہے چنانچہ داؤ جی کہتے ہیں۔ ''اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے یہ سیوا سنگ یہ مسلم لیگ یہ ہیلپ پارٹیاں مجھے پسند نہیں۔'' (اجلے پھول، ص ۲۰۴)

۱۹۴۷ء کے فسادات پر ہر طرح کے افسانے لکھے گئے ہیں۔ دکھ بڑھانے والے، زخموں پر پھاہے رکھنے والے، کچوکے دینے والے، آس بندھانے والے، رقت سے کام لینے والے، کلیت کا مظاہرہ کرنے والے اور تاریخی بصیرت کو بروئے کار لانے والے— اشفاق احمد کے دو افسانے ''گڈریا'' اور ''بابا'' تو درد کی انتہائی حدوں کو چھوتے دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ''سنگ دل'' منّی کے رویے کے طفیل ترقی پسند افسانہ نگاروں کے تخلیقی رویے سے مماثل دکھائی دیتا ہے، بہر طور اشفاق احمد کی خوبی یہ ہے کہ اس قیامت کے منظر کو کسی بے رحم مصور کی طرح تمام رنگوں اور خطوں کی مدد سے مجسم کر دیتے ہیں۔ دو مثالیں دیکھیے:

''خاک کے ذرات، چنگاریوں کی طرح گرم اور نیزے کی انیوں کی طرح نوکیلے، پسینے سے تر جسموں میں نشتروں کی طرح اترتے چلے جا رہے تھے، اس پر رائفلوں کی سیٹیاں بجاتی گولیاں اور اسٹین گن کی تڑتڑ کرتی باڑھیں۔ انسان تھے سانس روکے سب برداشت کرتے گئے بچے پیاس کی شدت سے چلا رہے تھے ان کی ماؤں کا ایک ہاتھ ان کے منہ پر بھنچا ہوا تھا۔ دوسرا برقعہ سنبھال رہا تھا۔'' (بابا، ص ۲۲۸)

''دور دور تک آگ ہی آگ دکھائی دیتی تھی اور اس کے پیچھے مرنے مارنے والوں کا شور وغل ایسے لگتا تھا جیسے آسمانوں پر جہنم مکمل ہو چکا ہو اور اب زمین پر اس کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا ہو۔'' (تلاش، ص ۵۶)

''باوجود اس کے کہ میری اپنی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا۔ ٹرک چل رہے ہیں، ہو سکتا ہے نہ چل رہے ہوں، مغویہ لڑکیاں برآمد کی جا رہی ہیں شاید نہ کی جا رہی ہوں۔ پاکستان بن گیا ہے کیا پتا ہے نہ بنا ہو۔'' (سنگ دل، ص ۹۲)

''سنگ دل'' میں مغویہ عورتوں کی بازیابی کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے ''دونوں بازیافتہ لڑکیاں ابھی سوئی نہیں تھیں لیکن ان کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ان کی شکستہ قسمت گہری نیند سو رہی تھی۔'' (ایک محبت سو افسانے، ص ۹۲)

اشفاق احمد بھی تقسیم کے بعد یادوں کی جانب پلٹ کر دیکھتا ہے جہاں داؤ جی،

پروفیسر دیس راج اور پتا جی رہ گئے ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے زخم اس لیے بھرتے چلے جاتے ہیں کہ اس کی محبت کا مرکز دھرتی اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والی تہذیبی قدریں اور رسمیں نہیں، افراد تھے۔۔۔

پاکستان بننے کے بعد ہوسِ زر نے جس طرح امیدوں، آرزوؤں اور خوابوں کو چاٹا۔ اس کی کچھ جھلکیاں اشفاق کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔

''ابا جان نے لکھا تھا کہ بڑے سوچ بچار کے بعد انہوں نے سنت نگر میں میری نسبت توڑ دی تھی کیونکہ اس شادی سے ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا اب وہ ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جو حکومت کے کسی بھی بڑے محکمے میں پرمٹ آفیسر ہوتا کہ اس کی بدولت ہمیں بھی سرکاری فائدہ پہنچ سکے (ص ۲۹۱)..... بعد میں معلوم ہوا کہ وہ افسر ایک سال کے اندر اندر ریٹائر ہونے والا ہے، اس لیے ارادہ ترک کر دیا۔'' (ایل ویرا، ص ۲۹۶)

''جس الماری میں چیک بک، ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ، آدم جی شوگر مل کے شیئرز، نٹ یونٹ، ای ایف یو کی پالیسی اور مکان کی رجسٹری رکھی ہے، اس کا پٹ کھولو تو اس میں سے بھی ایسی ہی ٹھنڈی ہوا آیا کرتی ہے۔ چاہے موسم کوئی بھی ہو۔'' (صحانے افسانے، ص ۴۳)

رفتہ رفتہ اشفاق احمد کے فکری شعور نے زہر خند میں پناہ لی ہے چنانچہ اب ان کا تلقین شاہ ہی ان کی پہچان بن گیا ہے۔ ''ماسٹر روشی'' میں بھی یہی زہر خند کرب کے طوفان کے سامنے بند باندھتا ہے ہمارے ثقافتی محاذ پر دادِ شجاعت اور داد عیش دینے والے کردار جب مالی مدد کی اپیلیں کرتے ہیں اور ان کی شراب اور طوائف سے رغبت کو نظر انداز کر کے جب بہت سے لوگ اور ادارے مضطرب ہو کر کاوشیں کرتے ہیں تو تیس سال تک چارپائیوں کے پائے بنانے والا بابا ابراہیم موتیا بند سے ہار کے لجاجت آمیز لہجے میں ہم سب کا دامن پکڑ کر کہتا ہے ''بچی کو روپے میرے نام بھی لگوا دے میرا ٹیم پاس ہوئے گا۔'' (ص ۴۵)

''مانوس اجنبی'' کے آغاز میں پاکستان کے تلخ پانیوں میں موجود جزیرہ شیریں اسلام آباد کی نمائندہ مخلوق کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے۔

''وہ بھی وٹامن کھاتی تھی، وہ بھی کولون لگاتی تھی اس کو بھی منسٹری سے بلاوا آیا تھا اس نے بھی پی سی ون فارم غلط بھر دیا تھا..... اس کو بھی ایک سال کی اور ایکس ٹینشن مل گئی تھی وہ بھی خوش دلی سے ڈھاکہ فال کا صدمہ سہ گئی تھی۔'' (سفر مینا، ص ۱۸۳)

موجودہ دور میں اشفاق کا نام ''متصوفانہ'' رویے کی وجہ سے متنازعہ فیہ بن گیا ہے کیونکہ ان کے بیشتر نکتہ چیں یہ گمان کرتے ہیں کہ انہوں نے ''متصوفانہ رویہ'' بعض عملی مقاصد کے حصول اور سیاسی مقاصد کی تکمیل کی خاطر اپنایا ہے وہ اپنے ضیاء الحق دور میں تازہ تر افسانوی میڈیم ''ٹی وی ڈرامے'' کے ذریعے قاتلوں کو معافی دینے کی اپیل کرتے ہیں۔ ملا کو ہیرو بناتے ہیں، آئن سٹائن کو صوفی ثابت کرتے ہیں، مغربی علوم وفنون کی نارسائی کا ذکر شدومد سے کرتے ہیں وغیرہ، ماجرا یہ ہے کہ اشفاق احمد کے ہاں تصوف سے رغبت گزشتہ پانچ چھ سالوں میں بڑھی تو ہے مگر پیدا انہی برسوں میں نہیں ہوئی، داؤ جی بھی ایک صوفی کردار ہے۔ ''فہیم'' کے نانا جی بھی درویش کی خدمت گزاری کے لیے نوکری چھوڑ دیتے ہیں۔ ''ایل ویرا'' میں بھی صوفی کے دل اور یوگی کی آنکھ کا ذکر ملتا ہے۔ (ص ۲۸۴)

اسی طرح محبت اور انسانیت سے ان کا والہانہ لگاؤ بھی انہیں صوفیوں سے محبت کا اہل بناتا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان برسوں میں اشفاق احمد کا صوفی ملا بن بیٹھا ہے اور یوں اس کے ایک افسانے ''مسکن'' کے ایک کردار کا مکالمہ یاد آتا ہے۔

''تم نے مجھے اس قدر کمزور کیوں کر سمجھا؟ کیا مجھ میں نبرد آزمائی کی قوت نہیں؟ کیا میرے کندھوں پر ایک شاطر کا سر نہیں۔'' (ایک محبت سو افسانے، ص ۱۰۰)

بہر طور اشفاق احمد کا افسانہ ''بیا جاناں'' اس متصوفانہ واردات کو لیے ہوئے ہے۔ جسے بعد میں اشفاق احمد نے اپنے ٹی وی ڈراموں کے ذریعے اجاگر کیا۔

مغرب کی قدروں اور ثقافتی رویوں کے خلاف اشفاق احمد نفرت کے شدید جذبات رکھتے ہیں، حالانکہ وہ اس ''جہنم'' میں جلنے والے کرداروں کے سامنے اپنے آپ کو ہمدرد معالج بنا کر پیش کرتے ہیں، پر حقیقت میں وہ انہیں اور کچوکے لگاتے ہیں اور آخر کار یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

عصرِ حاضر کی صنعتی ترقی نے جو رخ اختیار کیا ہے وہ انسانیت کے لیے قاتل ہے۔

''یہ جتنا بھی گلٹ (Guilt) اس دنیا میں موجود ہے۔ سیکس اور پالیٹکس اور انفرمیشن کی وجہ سے ہے۔ ہر تیسرا آدمی السر کا شکار ہے اور ہر چوتھے آدمی کی شریان پھٹ رہی ہے اور ہر پڑھا لکھا ہارٹ اٹیک سے مر رہا ہے۔ ہمیں ضرورت سے زیادہ انفرمیشن نے روگی بنا دیا ہے۔''
(قصہ نل دمینتی، سفر مینا، ص ۱۷۱)

لوگوں کی بجائے چیزوں پر جان دینے والوں اور اشتہاروں کی اکساہٹ پر زندگی میں دیوانہ وار بھاگنے اور دوڑنے والوں سے انہیں بہ ظاہر ہمدردی ہے۔ مگر حقیقت میں وہ ان کے خلاف بغض رکھتے ہیں ایسے گھرانوں کے آئیڈیل کیا ہیں۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ کیسے بڑھتا اور سمٹتا ہے اور ان کی ترجیحات کیا ہیں، ان سب کا ذکر کرتے ہوئے اشفاق احمد اپنی تلخی چھپا نہیں سکتے۔

''سونی وی سی آر کے لیے استعمال کا لفظ سن کر اور اس دیدہ دلیری سے ولگر طریقے پر سن کر بختیار کی روح بلبلا اٹھی۔'' (ادب لطیف، اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۵۹)

''شائستہ امریکی رسالے ٹائم، کی طرح خوب صورت، جھوٹی اور خوشبو دار تھی۔'' (قصہ نل دمینتی، سفر مینا، ص ۱۶۳)

''یہ محرومی کا لفظ تم نے کہاں سے سیکھا؟''..... شائستہ نے شرما کر کہا۔ ''ٹیلی ویژن کے پروگرام بصیرت میں ایک مولوی صاحب نے یہ لفظ استعمال کیا۔ جو مجھے اچھا لگا اور میں نے اسے یہاں استعمال کر دیا۔'' (قصہ نل دمینتی، سفر مینا، ص ۱۶۸)

اگرچہ اشفاق احمد ان لوگوں کا بھی مذاق اڑاتے ہیں جو اجتماعی احوال کے آئینے میں انفرادی طرزِ عمل کا عکس دیکھتے ہیں۔

''جب میری اور تری محبت کا افسانہ عام ہوگا تو مستقبل کے نقادوں کو اور مبصروں کو آج کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالات سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی اور ان کو زور لگا لگا کر پرانے قصوں اور قدیم داستانوں سے اس وقت کی گھٹن کے آثار علامتوں میں تلاش کرنے کے بجائے سیدھے سبھاؤ معلوم ہو جائے گا کہ سہیل شائستہ پر جان کیوں دیتا تھا۔'' (قصہ نل دمینتی، سفر مینا، ص ۱۷۲)

تاہم اشفاق احمد سماجی امتیازات، عدم مساوات، ناانصافی اور ریاکاری کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو اسی لیے کہ یہ کسی فرد کی روح کو مسخ کر دیتے ہیں ''وہ گاتو'' میں محلوں میں بسنے والے ان لوگوں کے خلاف اپنی نفرت کو چھپا نہیں سکتا جو اپنے ماتحتوں کے معصوم بچوں کی معصوم خواہشوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں وہ ''محسن محلّہ'' کی ریاکاری کو فراموش نہیں کر سکتا جو اپنے سب سے زیادہ معصوم مکیں ماسٹر الیاس کو بے بسی کی موت تو مرنے دیتا ہے پر اس کی رسم قل کے لیے آٹھ سو گیارہ روپے کا چندہ جمع کر لیتا ہے۔ اسی طرح ''کالج سے گھر تک'' خواب و خیال کی دنیا سجانے والے ہر فرد کے الم ناک تضادات جس خوبی سے پیش کیے گئے ہیں اس پر پختہ سماجی شعور رکھنے والا افسانہ نگار ہی قادر ہے۔

اشفاق احمد کے ایک افسانے ''قاتل'' کا اقتباس دیکھیے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ہمارے ہاں مروج قانونی موشگافیوں اور نظام انصاف کی بیساکھیوں سے ہی آشنا نہیں اس کا ہاتھ پاکستانی کردار کی نبضوں پر بھی ہے ایک کرایہ دار خاتون مالک کے ساتھ جھگڑے کے بعد اس طرح کی رپورٹ پولیس میں درج کراتی ہے۔

''مکان ہر دو فریقین'' ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں بلکہ ایک دیوار مشترکہ رکھتے ہیں، بوجہ موسم گرما فریقین اپنے اپنے کوٹھوں پر رات کو سوتے ہیں، مستغیثہ باعزت بیوہ ہے، ملزم صبح اٹھ کر اپنے کوٹھے پر مستغیثہ کی جانب منہ کر کے ہر روز بہ نیت توہین شرمساری مستغیثہ برہنہ ہو کر پیشاب کرتا ہے، جس سے شرمساری کی توہین ہوتی ہے، چنانچہ کل صبح کو ملزم مذکورہ اسی طرح پیشاب کر رہا تھا، مستغیثہ کے منع کرنے پر فحش گالیاں بہ نیت توہین بالقصد دینی شروع کر دیں، لہٰذا استدعا ہے کہ ملزم کو سزائے قانونی دی جائے۔'' (سفر مینا، ص ۱۵۳)

اشفاق احمد بے حد طاقت ور متکلم ہے، اُس کے پاس اپنے علم اور مشاہدے کو کسی مخصوص نظریے میں ڈھالنے کی صلاحیت ہے، سو اسی زعم میں اب ''طلسم ہوش افزا'' کی جانب آیا ہے، اس مجموعے میں بارہ افسانے ہیں، قصاص، میں پنجاب کے اُن لوک قصوں کے پس منظر میں نئی معاشرت کے اجزا سے ایک نئی کہانی بنائی ہے، جس میں اپنے سوار کے قاتلوں کو اب گھوڑے نہیں

لینڈ روور پہچانتی ہے اور قصاص بھی لیتی ہے، نظام انصاف کی رسومات تب بھی وہی تھیں جواب ہیں، سو اشفاق احمد نے یہ تو بتا دیا کہ پجارو والوں کی وارث تو یہ مہنگی گاڑی ہے، جو قصاص لے سکتی ہے، خونِ خاک نشیناں جو رزقِ خاک ہو، اُسے تو کسی وراثت اور قصاص کی حاجت نہیں۔ فنی اعتبار سے افسانہ بے حد موثر ہے، زرعی سماج میں قتل کے معروف محرکات سے لے کر ہمارے نیم صنعتی معاشرے میں فرقہ واریت کے حوالے سے دہشت گردانہ قتل تک کی منظر نگاری کے لیے اشفاق احمد بے پناہ تخلیقی صلاحیت اور اظہاری امکانات سے کام لیتے ہیں۔ ''ملک مروت'' موت کے متعین لمحے کے حوالے سے اشفاق احمد کی مبلغانہ صلاحیت کا افسانوی اظہار ہے جبکہ ''سونی'' افراد کی بجائے اشیا سے انسان کی بڑھتی ہوئی الفت کا ماجرا ہے اور ظاہر ہے کہ اس مجموعے کے نام کی مناسبت سے ''سونی'' وی سی آر نہ صرف اپنے محور ناظر سے مکالمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ اُس کی بیوی سے فاصلہ پیدا کرنے میں جذبۂ رقابت کا بھی مظاہرہ کرتا ہے۔ 'بچھے چھیکا بیتس، بہاول نگر کالج میں موجود ایک عارضی لیکچرار کے ایسے ریاضیاتی فارمولے کو ظاہر کرتا ہے جس سے اُس ملک کے اصل حکمران یعنی ورلڈ بینک کے مغربی نمائندے بھی تلملا اٹھتے ہیں جس پر مقامی نام نہاد بادشاہ انہیں یقین دہانی کراتے ہیں۔

''اگر مناسب سمجھیں تو ہماری رعایا کے ایک فرد، چالوسوچ کے منحرف پروفیسر ساعتی کو خود گرفتار کر کے لے جائیں اور اپنے ملک کے کسی قید خانے میں قید کر دیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اور اگر ہم پر اعتبار کریں تو اُسے بے شک ہماری سلطنت کے کسی بھی پسندیدہ قید خانے میں ڈال کر اپنا تالا لگا دیں اور چابی اپنے ساتھ لے جائیں۔''

بینک کے نمائندوں نے سر جھکا کر اور یک زبان ہو کے کہا۔ ''یور میجسٹی! آپ بے شک اپنا تالا چابی لگائیں، ہمیں آپ پر پورا اعتماد ہے۔ ہم نے چابی ساتھ لے جا کر کیا کرنی ہے!'' (طلسم ہوش افزا، ص ۴۷۔۴۸)

''سعید جونیئر'' ضمیر کو عاق کرنے سے متعلق ایک طنزیہ ہے۔ ''آخری حملہ'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشفاق احمد برس ہا برس اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر بھی رہے ہیں۔ ''کہکشاں ٹیکسی

اسٹینڈ'' کو بھی ایک فلاسفیہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے مگر سماجی طنز غالب ہے، 'پوری جان کاری، قلارے اور کوٹ ادو پاور ہاؤس، مغربی ٹیکنالوجی اور ہمیں مرعوب کرنے والے علوم اور علماء و ماہرین کی ایسی تضحیک ہے، جو ہمارے دلوں سے اُس کی دہشت نکال سکے، ''بولتا بندر'' بابا اشفاق کی جنس کے حوالے سے غیر معمولی معلومات اور متصوفانہ رغبت کو ظاہر کرتا ہے۔ ''صبحانے فسانے'' میں بائیس افسانے ہیں۔ ''ماسٹر روشی'' بھی اس میں شامل ہے جو ''۱۹۷۱ء کے منتخب افسانے'' (مرتب ناصر زیدی) میں موجود ہے، اس مجموعے میں 'بندر لوگ، ڈھور ڈنگر کی واپسی، راز دان، پل صراط اور پاسپورٹ، دکھووکھ، قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا، بیک گراؤنڈ اور مسرور مرثیہ' اشفاق احمد کے اسلوب کے وہ عام افسانے ہیں جن کے بارے میں اُس کی خوش فہمی کو یہ اعتماد ہے کہ اب وہ اُس مقام پر ہے کہ وہ جو کچھ بولے گا اور لکھے گا وہ افسانہ ہوگا۔ ''آڑھت منڈی'' میں حکومت اور غیر سرکاری تنظیموں کے غربت ہٹاؤ یا کم کرو جیسے منصوبوں کو غریبی بیچنے کے منصوبے بتایا گیا ہے۔ ''شازیہ کی رخصتی'' کشمیر کاز کے حوالے سے لکھا ہوا ایک طنزیہ ہے جو اشفاق احمد کے مخصوص طنز کا فنی اعتبار سے شکار ہو گیا ہے۔ ماجرا یہ ہے کہ اشفاق احمد اُردو کا ایک ایسا افسانہ نگار ہے، جس کے پاس افسانہ لکھنے کی بے پناہ صلاحیت ہے، وہ انسانی روح اور دُکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے، مرکب اور تہ دار صورتِ حال پیدا کرنا جانتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کے پاس اظہار کی غیر معمولی صلاحیت ہے، پھر یہ کہ پنجابی کے روز مرے محاورے، لوک دانش اور شعر و ادب کے اعلیٰ ترین نمونوں کی قوت اُس کی زبان میں رچی ہوئی ہے، اس لیے وہ جب کوئی بڑا افسانہ لکھتا ہے تو وہ ''گڈریا'' کی طرح شاہ کار ہو جاتا ہے، ''بے غیرت مدت خان'' بے شک لٹتے ہوئے افغانستان میں ایک اور طرح کی لوٹ مار (عجائب گھر کے غائب ہوتے نوادرات کے پیچھے سامراجی تاجر) کو سامنے لا کر اپنے موضوع کے اعتبار سے چونکا دینے والا افسانہ بن جاتا ہے مگر اس میں وہ تاثیر نہیں جو اس مجموعے کے پہلے افسانہ ''اماں سردار بیگم'' میں ہے، یہ افسانہ بلاشبہ ایک شاہ کار ہے، اگرچہ اس میں بھی اشفاق احمد نے پوری کوشش کی ہے کہ موجودہ معاشرت کو کوستے ہوئے (''اس زمانے کی مائیں بچوں کو اپنی عقل و دانش سے یا

نفسیاتی ذرائع سے یا ڈاکٹر سپوک کی کتابیں پڑھ کر نہیں پالتی تھیں بلکہ دوسرے جانوروں کی طرح صرف مامتا کے زور پر پالتی تھیں'' ص ۸) اس افسانے کو بھی تلقین شاہ کی نذر کر دیں مگر اس میں ایک غیر معمولی کردار کے بارے میں اشفاق احمد کی والہانہ یاد، ایسی فضا بناتی ہے جو افسانے کو اُردو کے گنے چنے افسانوں میں شامل کر دیتی ہے۔

''میری ماں فکرمندسی ہوگئی، اُس نے بڑی دردمندی سے مجھے غور سے دیکھا اور کوئلوں پر پڑی ہوئی روٹی کی پروانہ کرتے ہوئے کہا، ''اگر تو نے سچ بولنا ہی ہے تو اپنے بارے میں بولنا، دوسرے لوگوں کی بابت سچ بول کر اُن کی زندگی عذاب میں نہ ڈال دینا۔'' (ص ۱۹)

اماں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب اگر اللہ کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے اور اُسے صرف مانا جائے تو وہ جلدی سمجھ میں آجاتا ہے۔'' (ص ۲۷)

''اماں کی قبر کے بارے میں سب کا اپنا اپنا خیال اور اپنا اپنا گمان ہے لیکن یقین سے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے یا صحیح سوچ رہا ہے۔ لیکن میں جو کسی حد تک ان کے مزاج سے واقف اور ان کی نفسیات کا آشنا ہوں، مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی قبر اٹھا کر کہیں اور لے گئی ہیں، اصل میں میری ماں کے زمانے کی عورت محبت کے میدان میں سب سے آگے ہوتی تھی اور جب انعام تقسیم کرنے کا وقت آتا تھا تو غائب غلہ ہو جاتی تھی، وہ خودنمائی اور خودستائی کے فن سے ناآشنا تھی اُس کو مکٹ، پہنچیاں پہن کے اور سرمہ کاجل لگا کے مہمانِ خصوصی بننے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا، تعریف و توصیف کے موقعوں پر وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی اور ایسے اوہلے میں چھپ جاتی تھی کہ مدتوں اُس کے کوئی آثار نہیں ملتے تھے، وہ اپنی ہر کارکردگی کے پیچھے اپنی لاموجودگی کا امپریشن برقرار رکھتی تھی اور غائب سے غائب تر ہوتی رہتی تھی، تخلیق تو کرتی تھی کہ وہی یہ کام کر سکتی تھی، لیکن اپنی تخلیق کے چوکھٹے کے اندر کسی کارنر میں اپنا نام اور تاریخ نہیں لکھتی تھی۔'' (ص ۳۰۔۳۱)

☆☆☆